

## ملک غلام علیؒ کی یاد میں

(۱)

قاضی حسین احمد

ملک غلام علی صاحب مولانا مودودیؒ کے شاگرد و رشید تھے۔ آپ اسلامیہ کالج لاہور کے زمانہ طالب علمی سے مولانا مودودی کے حلقہٴ مجوش ہو گئے تھے۔ مولانا مودودی کی شخصیت ہمہ پہلو تھی۔ وہ علمی اہتمام کے ساتھ ساتھ عملی سیاسی میدان میں اسلامی انقلاب کے داعی تھے۔ ایک دینی اور سیاسی جماعت کے بانی اور رہنما کے طور پر بھی اپنی جماعت کی نگرانی بھی کرتے تھے، اور عالمی اسلامی تحریک کے قائد کی حیثیت سے پوری دنیا کی اسلامی تحریکیں بھی ان کی طرف رہنمائی کے لیے دیکھتی تھیں۔ ملک صاحب نے مولانا مودودی کی فکر، ان کی سیاسی حکمتِ عملی اور ان کے فہم کو پوری طرح جذب کیا، لیکن اپنے لیے علمی اور فکری میدان کو منتخب کیا اور اس کام میں مولانا کے معاونِ خصوصی بن گئے۔ ملک صاحب نے اپنے فرضِ منصبی کو اس خوبی سے نبھایا کہ ملک صاحب "اور مولانا مودودی" کے اسلوب اور ان کے طرزِ تحریر میں بھی فرق کرنا مشکل تھا۔ مولانا مودودیؒ کے پائے کی علمی شخصیت اگر کسی کو یہ کہہ دے: ملک صاحب! دکھانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ آپ میری طرف سے لکھ کر بھیج دیا کریں، تو اعتماد کی اس سے بڑی سند اور کیا ہو سکتی ہے۔

ملک غلام علیؒ کی طبیعت میں شکستگی اور لطیف مزاج کی چاشنی تھی جس نے ان کے عالمانہ اظہار کے ساتھ مل کر ان کی شخصیت کے حسن کو دو بالا کر دیا تھا۔

میں ۱۹۷۱ میں افغانستان کے مشہور اسلامی صحافی منہاج الدین گمبیز کو لے کر لاہور آیا۔ ان دنوں مولانا صاحبؒ صاحبِ فراش تھے۔ بیماری اور ضعف کی حالت میں چارپائی پر لیٹے لیٹے انھوں نے منہاج الدین گمبیز شہید سے مختصر ملاقات کی۔ گمبیز شہید نے مولانا کی صحت کے پیشِ نظر ان کے ساتھ طویل بات چیت کرنا مناسب نہیں سمجھا اور طے ہوا کہ علمی مسائل میں ملک غلام علی صاحب کی رہنمائی حاصل

کی جائے۔ گمبیز صاحب سے ملک صاحب کی طویل علمی گفتگو میں، میں بھی شریک رہا۔ یہ گفتگو ایک جدید اسلامی ریاست میں سیاسی نظام اور خواتین کے دائرہ کار سے متعلق تھی۔ اس ملاقات میں مجھے اندازہ ہوا کہ علمی مسائل میں ملک صاحب "مولانا مودودی" کے موقف کی پوری پیروی کرتے ہیں۔ اور اپنے فاضل استاد کے موقف کے حق میں دلائل و براہین سے مسلح ہیں۔

عمر کے آخری حصے میں ملک غلام علی صاحب کے جوان سال بیٹے ملک انعام اللہ، کابل کے شمال میں پروان کے محاذ پر شہید ہو گئے (۱۱ اگست ۱۹۸۹ء)۔ یہ افغانستان میں سوویت افواج کی مداخلت کا آخری سال تھا۔ ملک صاحب کے پاس میں تعزیت کے لیے گیا تو انہوں نے سعادت مند بیٹے کے بارے میں بتایا کہ تقریباً پانچ سال سے جمادنی سبیل اللہ میں مصروف تھا۔ ملک صاحب کی بیماری کی اطلاع پر لاہور آیا اور ایک ماہ تک والد صاحب کی خدمت میں رہا۔ جب ملک صاحب صحت یاب ہو کر ہسپتال سے گھر واپس آئے تو پھر والد محترم کی خدمت میں عرض کی کہ اب مجھے اپنے کام پر جانے کی اجازت دیجیے۔ والدین کو معلوم ہے کہ خود جماد پر جانے کی نسبت اولاد کو خندہ پیشانی سے جماد پر رخصت کرنا اور ان کی شہادت کی خبر کو خندہ پیشانی سے سننا اولیاء اللہ کا کام ہے۔ ملک غلام علی صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ دونوں اس بڑی آزمائش میں کامیاب رہے۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو قابل رشک ہے اور اس میدان میں ان کے رفقاء میں سے ان کے ہم پلہ کم ہی ہیں۔

اپنی اہلیہ کے سامنے جب میں ملک غلام علی صاحب کے صبر و استقامت، ان کی طبیعت کی نرمی اور شیرینی کے پہلو کا ذکر کرتا ہوں تو وہ بتاتی ہیں کہ ملک صاحب کی اہلیہ محترمہ بھی اس لحاظ سے ملک غلام علی صاحب کی شخصیت ہی کا پر تو نظر آتی ہیں۔ یہ سعادت کم ہی لوگوں کو نصیب ہوئی ہے کہ اہل و عیال بھی مکمل طور پر ہم آہنگ ہوں۔ یہ راہِ خدا میں ملک صاحب کے اخلاص اور لہیت کی برکت تھی کہ ان کا پورا ماحول اس رنگ میں رچا بسا تھا۔

ملک غلام علی صاحب آخری وقت تک سب و اطاعت کے اعلیٰ ترین درجے پر قائم رہے۔ جماعت کی قیادت کی ذمہ داری ہم جیسے کم مایہ لوگوں پر آپڑی۔ یہ بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے کہ کسی کو اپنے سے کم تر آدمی کی اطاعت کرنی پڑے۔ میں عمر تجربے اور علم و فہم کے لحاظ سے ان کے ہم پلہ نہیں تھا، لیکن محض امیر جماعت کے منصب کی وجہ سے انہوں نے مجھے اپنا مکمل تعاون پیش کیا۔ وہ آخر وقت تک جماعت اور امیر جماعت کے ساتھ رہے۔

ملک صاحب نے جوانی کے عالم میں اسلام کو سمجھا۔ اسے دل و جان سے اپنا طریق زندگی بنایا۔ زندگی کے آخری لمحے تک اس کی سربلندی کے لیے ایک نظام کی جکڑ بندیوں کو قبول کیا۔ اس نظام کے

اندر اپنی صلاحیتیں اقامت دین کی جدوجہد کے لیے وقف کیں اور کامل اطاعت و وفاداری کی حالت میں اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کی۔ ان کی زندگی اس ارشاد ربانی کے مطابق تھی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَموتُوا إِلَّا وَأنتُمْ مُسْلِمُونَ - (اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ وَأَجْعَلْهُ مِنْ وَرَقَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ)

(۲)

### میاں طفیل محمد

مولانا ملک غلام علی صاحب سے میرا تعارف اپریل ۱۹۴۳ء میں اس وقت ہوا جب میں وکالت کے بعد ٹھیکیداری، اور ٹھیکیداری کے بعد اپنے ایک رفیق چوہدری محمد انور کے ساتھ شراکت چھوڑ کر مستقل طور پر جماعت کے ہمہ وقتی کارکن کی حیثیت سے، نواں کوٹ لاہور سے دارالاسلام پٹھان کوٹ گیا۔ اس سے پہلے میں ملک صاحب اور مرکز جماعت کے کسی بھی آدمی کو، سوائے مولانا مودودی صاحب کے، نہیں جانتا تھا۔ دارالاسلام میں مجھے جو رہائشی کوارٹرز ملا اس کے ایک طرف ملک غلام علی صاحب، اور دوسری طرف مولانا مودودی صاحب کی والدہ محترمہ، جن کو ہم سب دادی اماں کہتے تھے، رہتی تھیں۔ ملک غلام علی صاحب سے اگلے کوارٹرز میں نعیم صدیقی صاحب رہتے تھے۔

ملک غلام علی صاحب کے ابتدائی حالات، جو میرے علم میں آئے ہیں وہ، یہ ہیں کہ وہ سون سکیر ضلع خوشاب کے ایک بااثر معزز اعوان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پائی۔ پھر وہ اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ لاہور میں آگئے جہاں انھیں مولانا علم الدین سالک جیسے اساتذہ کی شاکردی کا شرف حاصل رہا۔ سالک صاحب نے ملک صاحب کی سنجیدہ اور متین و ذہین طبع کے پیش نظر ان پر خاص توجہ دی اور ان کے ذہن و اخلاق کو سنوارا اور جلا دی۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں داخل ہو گئے۔ وہاں وہ تھرڈ یا فورٹھ ایئر میں پڑھتے تھے کہ مولانا مودودی صاحب اسلامیہ کالج میں دینیات کے اعزازی لیکچرر مقرر ہوئے۔ مولانا مودودی صاحب کے ان لیکچروں سے، ملک صاحب اور ان کے متعدد ساتھی، اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی کایا ہی پلٹ گئی۔ شیخ فقیر حسین مرحوم اور چوہدری غلام جیلانی مرحوم (مدیر و مالک ہفت روزہ ایشیا) بھی مولانا مودودی صاحب کی انہی دنوں کی فتوحات میں سے تھے۔ مولانا مودودی صاحب کے

ان لیکچروں کا شہرہ لاہور کے دوسرے کالجوں میں ہوا تو دوسرے کالجوں کے طلبہ بھی یہ لیکچر سننے کے لیے آئے گئے۔ چنانچہ کالج کی انتظامیہ نے مولانا کے لیکچر کا انتظام کلاس روم کے بجائے اسلامیہ کالج کے صیبا ہاں میں شروع کر دیا۔ پنجاب کے انگریز گورنر نے مولانا مودودی صاحب کے تصور دین و دنیا سے لاہور کے کالجوں کے طلبہ کو متاثر ہوتے دیکھا تو اس نے وزیر اعظم پنجاب سکندر حیات خاں کے ذریعہ انجمن صلیب اسلام کے ذمہ داروں پر دباؤ ڈالا کہ وہ مودودی صاحب کا کوئی علاج اور اس صورت حال کا تدارک کریں، جس سے انجمن اور اسلامیہ کالج لاہور کے ذمہ دار سخت پریشان ہو گئے۔ مولانا مودودی صاحب کو یہ خدمت، جتنی اہم و مستردین کے طور پر ہی کر رہے تھے، ان کا کوئی ذاتی مفاد تو اس سے وابستہ نہیں تھا، اس لیے مولانا مرحوم نے انجمن اور کالج کی انتظامیہ کو پریشان دیکھ کر خود ہی دنیا سے لیکچر شپ سے استعفیٰ دیا اور ان کی پریشانی کو دور فرما دیا۔ اسلامیہ کالج سے مولانا مودودی صاحب کی علیحدگی کے بعد ملک غلام علی صاحب بھی اپنی تعلیم اور عہدہ چھوڑ کر مولانا کے ساتھ ان کے ہاں آ گئے، اس لیے کہ مولانا مودودی صاحب کے نزدیک انگریز کی تعلیم گاہیں مسلمان نوجوانوں کے لیے تعلیم و تربیت کے ادارے نہیں بلکہ قتل گاہیں تھیں، جہاں ان کو اپنے دین و ثقافت اور ذوق و کردار سب سے بیگانہ و باغی بنانے کی تربیت دی جا رہی تھی۔ افسوس ہے کہ یہ ادارے آزادی اور قیام پاکستان کے بعد اصلاح احوال کے بجائے سو گناہ تر مذبحوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

لاہور میں مولانا مودودی صاحب کے ہاں ملک صاحب کے لیے کوئی کام اور منجائش نہ ہونے کی وجہ سے ملک صاحب کو جالندھر میں سید عبدالعزیز شرقی صاحب کے ہاں بھیج دیا گیا، جو غالباً وہاں پر ہیں چلاتے تھے۔ سید عبدالعزیز شرقی صاحب ان چار حضرات میں سے ایک تھے، جنہوں نے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کی طرف سے اپنے ہم خیال ساتھیوں کے لیے پہلی پکار پر لبیک کہا تھا۔

جون ۱۹۴۳ میں دوسری جنگ عظیم کے دور ان جب جاپان کی افواج انڈونیشیا اور سنگاپور وغیرہ کو روندتی ہوئی برما کی مشرقی پاکستان سے ملحق سرحد تک پہنچ گئیں، اور انہوں نے انگریزوں کا، فخر برطانیہ کو کین الزبتھ نامی سب سے بڑا جہاز خلیج بنگال میں ڈبو دیا، تو انگریز کو ہندوستان کی بھی فکر لاحق ہو گئی۔ حکومت ہند نے بڑے شہروں سے غیر ضروری آبادی کو مضافات میں منتقل ہو جانے کی ہدایت کی، تو مولانا مودودی صاحب بھی اپنے ادارہ ترجمان القرآن اور جماعت اسلامی کے مرکز کے ساتھ اسلامیہ پارک پونچھ روڈ لاہور سے دارالاسلام چھان کوٹ چلے گئے۔ ملک غلام علی صاحب بتاتے تھے کہ دارالاسلام چھان کوٹ منتقل ہونے کے بعد مولانا مودودی صاحب نے انھیں جالندھر سے دارالاسلام بلا کر مکتبہ ترجمان القرآن ان کے سپرد کر دیا۔ اور پھر وہ قیام پاکستان کے بعد، مرکز جماعت اور رسالہ ترجمان القرآن



کے دفاتر ۳۰ / ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء کو لاہور منتقل ہونے تک اسی کام پر مامور رہے، اور اپنے فارغ اوقات میں عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں اپنی استعداد بڑھاتے رہے اور مطالعہ میں مولانا کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔

لاہور آنے کے بعد اچھرہ میں جماعت اسلامی اور رسالہ ترجمان القرآن کے دفاتر قائم ہوئے۔ اب مولانا مودودی صاحب جماعت اسلامی ہند کے امیر کے بجائے صرف امیر جماعت اسلامی پاکستان رہ گئے تھے۔ ہندوستان کی جماعت اسلامی ہم سے الگ ہو کر جماعت اسلامی ہند یا بھارت بن گئی تھی، اور اس نے مولانا ابواللیث اصلاحی صاحب کو اپنا امیر بنا لیا۔ دارالاسلام پٹھان کوٹ سے پاکستان آنے کے بعد مولانا مودودی صاحب نے ملک غلام علی صاحب کو مکتبہ سے نکال کر اپنا خصوصی معاون بنا لیا۔ اس وقت سے مولانا مرحوم کے آخری لمحہ حیات تک ملک صاحب اسی منصب پر فائز رہے۔ اس طرح سے میں اور ملک غلام علی صاحب اپریل ۱۹۴۴ء سے ملک صاحب کے آخری یوم حیات تک دارالاسلام، اچھرہ اور منصورہ میں یکجا اور اکٹھے جماعت اسلامی کے ہمہ وقتی کارکن چلے آئے ہیں۔ اس درمیان میں ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۳ء تک ملک صاحب پاکستان کی شریعت کورٹ کے جج کی حیثیت سے اسلام آباد میں رہے۔ ان چار سالوں کے سوا اور کوئی وقفہ ہماری رفاقت میں نہیں آیا۔

مولانا ملک غلام علی صاحب نے بھی مولانا مودودیؒ کی طرح کسی یونیورسٹی یا دارالعلوم سے رسماً علم حاصل نہیں کیا۔ مولانا موصوف کی محبت و رفاقت اور اپنی ذاتی محنت و کوشش اور ریاضت سے علم حاصل کیا اور وہ علم و فضل اور فقہت کے بلند ترین مرتبہ پر جا پہنچے۔ اس سلسلے میں ان کے علم و فقہت کا اندازہ ان کے شریعت کورٹ پاکستان کے جج کی حیثیت سے صادر کردہ فیصلوں، رسائل و مسائل جلد ششم اور ہفتم، اور خلافت و ملوکیت پر اعتراضات کا علمی جائزہ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ علم و تقویٰ کے میدان میں، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے علاوہ، مولانا مودودیؒ کا ہم پلہ اگر کوئی شخص تھا، تو وہ ملک غلام علی مرحوم ہی تھے اور میرے نزدیک تو مولانا مودودی کا علم و فضل ملک صاحب کے ساتھ دفن ہو گیا ہے۔ اب اس پائے کا صاحب علم کوئی شخص ہمارے درمیان نہیں رہا ہے۔ اللہ رب العالمین ہی کی ذات پاک ہے کہ وہ اس خلا کو پُر کرنے کی کسی کو توفیق عطا فرمادے وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

جماعت اسلامی کی صفوں میں جو چند حضرات، صحابہ کا نمونہ اور ان کے نقش پا تھے، ان میں ملک غلام علی مرحوم کُل سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ملک غلام علی صاحب کی عالمانہ ذمہ داری اور دیانت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ مولانا مودودی صاحب کی زندگی کے آخری آٹھ دس سالوں میں ملک صاحب ہی مولانا کے نام آنے والے سوالات، استفسارات و مسائل کے جوابات تحریر فرماتے اور

ان کو مولانا مرحوم کے سامنے پیش کرتے۔ ان میں مولانا جن جو بات میں کوئی اصلاح و تبدیلی یا رد و بدل فرماتے ان سب کو تو ملک صاحب نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے منسوب اور ان کے نام سے شائع کیا ہے اور جن کو بہ جنم رہنے دیا اور یا جن کا جواب ملک صاحب نے مولانا مرحوم کے بعد خود ہی دیا ہے، ان سب کو اپنے نام سے شائع کیا۔ اس طرح سے ملک غلام علی صاحب کے غیر مطبوعہ رسائل و مسائل کی ایک دو جلدیں اور مرتب ہو کر شائع ہوں گی ان شاء اللہ۔

ملک غلام علی صاحب اپنے ذاتی اوصاف کے لحاظ سے انتہائی منکسر المزاج، سراپا اخلاص و تواضع، کم سخن، ظلی محرمی کے آئینہ دار اور اپنی ہی سوچوں میں غرق و رہنے والے تھے۔ میری پچاس سالہ رفاقت کے دوران، میں نے کبھی ان کو کسی سے لڑتے جھگڑتے تو درکنار بلند آواز سے کلام کرتے بھی نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا۔ کبھی کسی دوسرے کے کام میں دراندازی یا مداخلت نہیں کی۔ اپنے فرائض کی انجام دہی میں منہمک رہے۔ جو کام بھی مولانا مرحوم یا جماعت نے ان کے سپرد کیا اسے پورے انہماک سے انجام دینے میں لگ گئے یا پھر اپنے مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انہوں نے کبھی کسی معاملے میں مولانا مودودی صاحب یا مجھ سے اختلاف کیا، میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔

(۳)

### خلیل احمد حامدی

ملک غلام علی مرحوم، جن کا انتقال ۲۶ ستمبر ۱۹۹۳ کو منصورہ میں ہو گیا ہے، مولانا مودودی کے ابتدائی ساتھیوں میں سے تھے۔ موصوف ۱۹۲۰ میں سون سیکس میں پیدا ہوئے۔ یہ خالصتاً دیہاتی معاشرہ تھا، جہاں علم و تہذیب کے افق تو محدود ہوتے ہیں، مگر کچھ ایسی خوبیاں بھی اس میں پائی جاتی ہیں جو آئندہ چل کر تہذیب و علم کے لیے اچھی بنیاد ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً طبیعت میں سادگی، قناعت، احترام باہمی، اہل علم کا اکرام اور دین کی اساسی اقدار کے ساتھ محبت و وابستگی۔ ملک صاحب ان تمام محاسن کو جلو میں لیے شہر میں داخل ہوئے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات خود ان کی زبان سے سن لیں:

”میرا تعلق ایک دیہی گھرانے سے تھا۔ میرے والد بہت دیندار تھے۔ تہجد گزار تھے، وہ اپنی حد تک نماز، روزہ اور نیکی کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ یہ ان کی عادت تھی۔ مجھے بچپن ہی سے تعلیم کا بہت شوق

تھا، اور میں سکول میں اچھے طلبہ میں شمار ہوتا تھا۔ پرائمری سے آگے تک ہر جماعت میں اچھے نتیجے کی بنا پر مجھے وحیفہ ملتا رہا۔ گاؤں کے بزرگ بتاتے تھے کہ گاؤں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی طالب علم کو وحیفہ ملا ہو۔“ (قومی ڈائجسٹ، جنوری ۱۹۸۰ء)

والدین کی ابتدائی تربیت انسان کی فطرت پر گہرے نقوش مرتسم کر دیتی ہے۔ ملک صاحب کے اندر اس تربیت کے آثار و معالم ملنے والوں کو پہلی ملاقات میں نظر آجاتے تھے۔ علی الخصوص دو باتیں؛ سادگی اور تدین۔ یہ دونوں باتیں انسانی سیرت کے اعلیٰ ترین جوہر سمجھی جاتی ہیں، اور جس انسان کے مقدر میں علم و دعوت کی وادیوں میں مراحل شوق طے کرنا لکھا ہو وہ ان جوہر کے بغیر یہ مراحل عبور نہیں کر سکتا۔

لاہور میں آمد

دیہاتی زندگی کی ان خوبیوں کو لیے ہوئے ملک صاحب شہر کی فضا میں آگئے۔ فرماتے ہیں: ”ہمارے علاقے میں نوشہرہ مرکزی قصبہ ہے۔ جہاں تھانہ، سول ہسپتال اور ہائی سکول ہے۔ میں اسی سکول میں تعلیم پاتا رہا تھا۔ تعلیم کا انتظام اور معیار وہاں اچھا نہ تھا۔ میرے ایک بڑے شفیق استاد تھے جو وہاں پڑھاتے تھے، لاہور کے رہنے والے تھے۔ میں نے ان سے ذکر کیا کہ اگر کوئی ایسی صورت بن جائے کہ لاہور جا کر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکوں تو بہت مناسب ہو گا۔ انھوں نے بھی میری تجویز پسند فرمائی، ان کا نام مولانا عبدالغفور تھا۔ حویلی کابلی مل میں ان کا مکان تھا۔ بہت نیک اور دیندار تھے۔ بی۔ اے، بی۔ ایٹے لے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں ان شاء اللہ تمہارا انتظام کرادوں گا۔ چنانچہ شیرانوالہ اسلامیہ ہائی سکول میں جو انجمن حمایت اسلام کے زیر اہتمام چل رہا تھا انھوں نے مجھے داخل کرادیا، اور سکول کاسب سے اچھا جو نیشن تھانہ وہ مجھے دلوا دیا۔“ (ایضاً)

یوں ملک صاحب یکایک سون سیکسری سادہ و محدود فضاؤں سے نکل کر لاہور جیسے شہر میں اوائل عمر میں ہی آگئے۔ اس نئے ماحول میں ہر چیز ان کے لیے نئی ہو گی، تعلیم کے میدان میں باہم مسابقت ہو رہی ہو گی، ملکی اور غیر ملکی مسائل پر سیاسی بحثیں ہوتی ہوں گی۔ خواہر تو نئے نئے پیکر میں سامنے آ رہے ہوں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت شامل حال نہ ہو تو یہ چیزیں انسان کو راور است سے منحرف بھی کر سکتی ہیں، مگر ملک صاحب کو اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی اپنی سابقہ اچھائیاں محفوظ رکھنے اور ان اچھائیوں میں مزید ترقی کرنے کے مواقع فراہم کر دیے۔ فرماتے ہیں: ”شیرانوالہ اسلامیہ ہائی سکول میں

یہ طریق کا یہ تھا کہ جب نماز کا وقت ہوتا، تو تمام اساتذہ اپنے اپنے طالب علموں کو ساتھ لے کر مسجد میں خود بھی نماز پڑھتے اور اپنے شاگردوں کو بھی پڑھاتے۔ بعض لڑکے یہ کہتے کہ چونکہ شیر انوار مسجد قریب ہے ہم تو وہیں نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ میں مولانا احمد علی صاحب کے درسوں اور خطبوں سے مستفید ہوتا رہا، ان کے پیچھے نماز پڑھتا رہا، اور میں نے ان کی مسجد کی صفیں بہت گھسائیں۔ اس زمانے میں درس، بند و نصیحت وغیرہ سب کچھ ہوتا تھا، ماحول کافی حد تک دینی اور اسلامی ہوتا تھا۔" (ایضاً)

## کالج کے ایام

سکول کی زندگی سے فارغ ہو کر ملک صاحب کالج کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔ اس دور میں کالجوں کے اندر انگریزی نظام تعلیم پوری قوت کے ساتھ رائج تھا۔ اس نظام تعلیم میں مادہ پرستی کا اس حد تک درس دیا جاتا رہا ہے کہ اسلامی عقائد و اخلاق کی جڑیں مل جاتی تھیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی نظام تعلیم سے مسلمانوں کے اندر الخاد و دہریت کو بڑا رواج ملا، اور اس کے نتیجے میں مسلمان نوجوانوں کے اندر طرح طرح کے غیر اسلامی افکار و نظریات در آنے لگے۔ ادب، تاریخ، معاشرت، معیشت اور سیاست، غرض ہر میدان میں فکری انتشار نے جنم لیا۔ یہاں بھی ملک صاحب اللہ تعالیٰ کی عنایت خاص سے بہرہ مند رہے، اور انھیں ایسے اساتذہ کا سایہ حاصل رہا جو انھیں خوب سے خوب تر بننے میں مدد دیتے رہے۔ ملک صاحب نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ اس کالج میں انھیں جو اساتذہ ملے ان میں ایک مولانا علم الدین سالک مرحوم تھے، جن سے ملک صاحب نے فارسی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کی۔ سالک مرحوم کی دیدارِ انہ طبیعت کے بارے میں ملک صاحب فرماتے ہیں: "یہ ناممکن تھا کہ ان کی کلاس میں کوئی شاگرد ننگے سر بیٹھے۔ ہر طالب علم ٹوپی لے کر آتا تھا، دوسرے پیرٹوں میں داہے رکھتا یا کہیں رکھ دیتا، لیکن لارسی کے پیرٹ میں اسے لازماً ٹوپی پہننا ہوتی تھی۔ اگر قمیص کا کوئی ٹن کھلا ہوتا تو وہ اعتراض کرتے اور کہتے ٹن بند کرو، اور اگر کسی کا سر ننگا ہوتا تو وہ پوچھتے "تمہارا نام کیا ہے؟" اگر جواب میں کوئی کہتا، "جی میرا نام غلام علی ہے یا غلام محمد، تو فرماتے: "نہیں نہیں، تمہارا اپنشنس گرجے میں ہوا ہے؟ تمہارا مسیحی نام کیا ہے؟" (ایضاً)

اس طریق تربیت پر آج کل کے ماہرین نفسیات طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمان نوجوانوں کی تربیت جس طرح اصلاح باطن کے لیے ضروری ہے، اسی طرح اصلاح ظاہر کے لیے بھی ضروری ہے۔ ظاہری اصلاح کا اثر باطن پر بھی پڑتا ہے۔



مولانا علم الدین سالک مرحوم کے علاوہ ملک صاحب کو کالج کی زندگی میں دوسرے بھی قابل قدر اساتذہ ملے، جنہوں نے ان کی فطری صلاحیت، دینی ذوق اور جستجوئے حق کے محرکات کو دبانے کے بجائے مزید اجاگر کیا۔ اور پھر خدا کا کرتا یہ ہوا کہ اسی کالج میں مولانا مودودیؒ ”کچھ عرصہ کے لیے پہنچ گئے اور ملک صاحب کا ان سے رابطہ ہو گیا۔

میرے نزدیک حالات و واقعات کا یہ تسلسل اتفاقات کی قبیل سے نہیں ہے، بلکہ جستجوئے حق رکھنے والے انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہِ حق آسان کرنے کے لیے جو ”توفیق“ دی جاتی ہے وہی ان تمام واقعات کے پیچھے کار فرما ہے۔

### مولانا مودودیؒ کی شاگردی میں

مولانا مودودیؒ کی اسلامیہ کالج سے وابستگی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ملک صاحب فرماتے ہیں :  
 ”ہمیں معلوم ہوا کہ مولانا مودودیؒ صاحب اب دینیات پڑھایا کریں گے۔ مولانا سے پہلے ٹونک کے مولانا عمر خان ہمیں دینیات پڑھاتے تھے۔ بڑے نیک اور با اصول آدمی تھے۔ وہ ضعیف ہو چکے تھے اور ان کی جگہ مولانا مودودیؒ تشریف لائے۔ مولانا سے جب انجمن کے حکام نے بات چیت کی تو مولانا نے فرمایا: ”میں اعزازی طور پر کام کروں گا، کوئی معاوضہ نہ لوں گا۔ میرے کام میں، طرزِ تعلیم میں آپ کسی قسم کی مداخلت نہیں کریں گے، کوئی قدغن نہ لگائیں گے، کوئی خاص گائیڈ لائنز (رہنما اصول) نہ دیں گے۔ میں خود ایک مصروف آدمی ہوں، لیکن بہر حال آپ نے پیش کش کی ہے، میں اس سے فائدہ اٹھاؤں گا، لوریوں نوجوان تعلیم یافتہ نسل تک میری آواز پہنچ جائے گی۔“ (ایضاً)

اس مشروط معاہدے کے بعد، مولانا مودودیؒ نے اسلامیہ کالج میں اسلامیات کا مضمون پڑھانا شروع کر دیا۔ مولانا کے پاس وقت کم ہوتا تھا اور ہر کلاس میں جا کر لیکچر دینا مشکل تھا۔ اس لیے ان کے مشورے کے مطابق تمام طلبہ کو ایک ہال میں جمع کر لیا جاتا، اور وہ بیک وقت سب کو لیکچر دیتے۔ ملک صاحب فرماتے ہیں: ”یہاں مولانا کو میں نے پہلی بار دیکھا۔ اس وقت ان کے بال بالکل سیاہ تھے۔ ٹوپی کالی پہنتے تھے، کبھی کبھی روی ٹوپی بھی پہنتے ہوتے تھے۔“

مولانا اپنے لیکچروں میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کی تشریح کرتے، اور بتاتے کہ اسلام محض پوجا پاٹ کا یا فقط عبادات کا دین نہیں ہے، بلکہ یہ عبادات تو دراصل ہمیں ایک بڑی عبادت کے لیے تیار کرتی ہیں، اور یہ عبادت پوری زندگی پر محیط ہے۔ اسلام کا ایک وسیع اور ہمہ گیر اجتماعی نظام ہے، جو زندگی کے

ہر شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں سیاست بھی ہے، معیشت بھی، معاشرت بھی، غرض ہر چیز اس کے دائرے میں آتی ہے، سیاست بھی اس سے خارج نہیں ہے۔

مولانا کے اس اندازِ تعلیم اور تشریحِ دین سے کالج کے اربابِ اختیار کچھ پریشان ہوئے۔ یہ تشریح انسان کو انسان کی غلامی سے نجات حاصل کرنے، اور طاغوتی نظام کو پاش پاش کر کے دنیا کے اندر دینِ حق کو غالب کرنے کی دعوت تھی۔ اس دعوت نے ہر دور میں اربابِ اختیار و اقتدار کو پریشان کیا ہے۔ جس زمانے میں مولانا اسلامیہ کالج کے اندر دین کی یہ تشریح نوجوان نسل کے سامنے کر رہے تھے، وہ انگریزوں کا دور تھا، اور انگریز حکمرانوں سے کالج کو گرانٹ ملتی تھی۔ اس لیے انجمن کے اربابِ اختیار نے محسوس کیا کہ مولانا کا طرزِ تعلیم انھیں منگا پڑے گا۔ انھوں نے مولانا کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ ”دینیات“ تک اپنے کام کو محدود رکھیں۔ مولانا محترم کو یہ حدود و قیود پسند نہ تھیں۔ انھوں نے جب یہ محسوس کیا کہ ان کی تقریروں سے یہ لوگ خدشات میں مبتلا ہو گئے ہیں تو انھوں نے خود ہی بڑھ کر اس سلسلے کو ختم کر دیا۔

### مولانا مودودی سے وابستگی

ملک صاحب کا رابطہ مولانا مودودی سے قائم ہو چکا تھا، بلکہ ملک صاحب کے بقول: ”مولانا کی ایک آدھ تقریر سن کر ہم تو دل ہی دے بیٹھے۔“

مولانا نے جب کالج چھوڑ دیا، تو ملک صاحب نے بھی تعلیم بیچ میں چھوڑ دی، اور مولانا کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو گئے۔ یہ وابستگی جذباتی و راندھی عقیدت پر مبنی نہ تھی، بلکہ ملک صاحب نے شعوری طور پر مولانا کے پیغام کو سمجھا، ان سے بحثیں کیں، اور پھر پورے شرح صدر و طمانیتِ قلب کے ساتھ مولانا کے شریکِ سفر ہو گئے۔ ملک صاحب کے بعض اساتذہ نے انھیں اس اقدام سے اپنی صوابدید کے مطابق روکنے کی کوشش کی، مگر ملک صاحب دل اور شعور دونوں کے ہاتھوں جو فیصلہ کر چکے تھے، وہ اٹل تھا، اور مشیتِ الہی اس کے پیچھے کار فرما تھی۔

تعلیم کا سلسلہ ختم کرنے کے بعد ملک صاحب نے اقامتِ دین کو زندگی کا مقصد بنا لیا۔ ان کی زندگی میں یہ ایک ایسا بنیادی انقلاب تھا جسے سرسری سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک نوجوان طالب علم، جو اپنے والدین کی ہزاروں تمناؤں کا مرکز ہو اور جسے خود بھی دنیاوی لحاظ سے اپنے روشن مستقبل کی کرنیں نظر آ رہی ہوں، اگر کوئی ایسا فیصلہ کرتا ہے کہ اس سے نہ والدین کی آرزو کیں بروئے

کار آئیں اور نہ ذاتی امتکوں کی تکمیل کی گنجائش رہے، تو یہ فیصلہ یقیناً کسی بالاتر ایمانی قوت کا مظہر قرار دیا جاسکتا ہے۔ اقامتِ دین کے اعلیٰ و ارفع نصب العین کو سمجھ کر ملک صاحب مولانا کی خدمت میں آئے، اور کہنے لگے: ”میں اپنی ہکلت تسلیم کرتا ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ مسلمان کے کرنے کا یہی کام ہے، اور اللہ تعالیٰ نے بہر حال مسلمان کو کسی ایسے کام کا ملکت نہیں ٹھہرایا جو ناممکن العمل ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اسے منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں یا نہیں۔“

اس کے جواب میں مولانا نے بھی اس جو ہر قابل کے سامنے اس موقع پر جن خیالات کا اظہار کیا، وہ ان کی داعیانہ شان کا نہایت اہم گوشہ واکرتا ہے: ”بہر حال مسلمان کے کرنے کا یہی کام ہے۔ بطور مسلمان انفرادی حیثیت سے اور اجتماعی حیثیت سے ہمارے ذمے یہی کام ہے کہ ہم دنیا کے اندر اسلام کی دعوت کو پھیلائیں اور دین کی اقامت کریں، خواہ کامیابی حاصل ہو یا نہ ہو۔ نتائج تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ بہت سے انبیاء گزرے ہیں کہ کسی کو ایک مقتدی ملا، کسی کو دو۔ قیامت کے روز بعض انبیاء تشریف لائیں گے تو انکے ساتھ ایک ایک، دو دو، ساتھی ہوں گے۔ بعض کے تو گھروالوں نے بھی ساتھ نہ دیا۔ اس لیے اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ خدا کے فضل سے کروڑوں مسلمان موجود ہیں، اگر وہ چاہیں تو کیوں انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔“

مولانا مرحوم کے اس پُر سوز اور جذبہ انگیز جواب کے بعد ملک صاحب نے اپنے جس ردِ عمل کا اظہار کیا وہ بھی کیا خوب ہے۔ ملک صاحب نے کہا: ”ہرچہ یاد اباد ماکشتی در آب انداختیم، میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔ میں نوجوان ہوں، میری کوئی زیادہ دینی تعلیم بھی نہیں، ویسے میں بالکل ہی کورا بھی نہیں ہوں۔ بہر حال میں آپ کے ساتھ ہوں، میں اپنی زندگی کو اس مقصد کے لیے وقف کرنے کا عہد کرتا ہوں۔“ (ایضاً)۔

### ثابت قدمی و استقامت

اس انقلابی فیصلے کے بعد ملک صاحب نے تعلیم کو ادھورا چھوڑ دیا۔ جیسا کہ پیچھے عرض کر آیا ہوں کہ ملک صاحب نے جب تعلیم کو ادھورا چھوڑ دیا، تو ان کے نہایت قابل قدر اساتذہ نے انھیں بہت سمجھایا کہ یہ ایک جذباتی فیصلہ ہے، تعلیم کو پانچ تکمیل تک نہ پہنچانا دانش مندانہ اقدام نہیں ہے۔ مگر ملک صاحب اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے، اور ان دانشوروں کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ ملک صاحب نے جذبات کی رو میں بہہ کر یہ کام کیا تھا۔ ملک صاحب کا یہ فیصلہ پورے شعور پر مبنی تھا، اور مستقبل نے بتا دیا کہ